بے شک تصوف میں اپنے مرشد سے حد درجہ عقیدت رکھنا عملاً ضروری ہوتا ہے۔ اور سلک "توحید فی الشیخ" کے تحت اسے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے کا واسطہ بنانا فطری ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اس معاملے میں توازن لازمی ہے، ورنہ اگر غلوئے عقیدت نے تخیل کو اس طرح بے عنان رکھا، تو جس مقصدِ عظیم کے لئے حضرت مولانا چالیس بیالیس سال تک سرگرم کار رہے، ہمیں یہ ڈر ہے، ان کی ذات سے اس طرح کرامات کے منسوب کرنے سے وہی مقصد فوت ہو جائیگا۔

زیر نظر کتاب مجلد ہے، ۲۲۴ صفحات ہیں، اور ہدیہ تین روپے۔

ملنے کا پتہ :- دفتر انجمن خدام الدین۔ اندرون دروازہ شیرانوالہ، لاہور ۵

(ا - س)

Development of Religious Thought in India (ھندوستان میں مذہبی فکر کی ارتقاء)

تاریخ کے کسی بھی دور میں جب دو مذاہب، دو تہذیبیں یا دو قومیں شروع میں ایک دوسرے سے متصادم ہوتی ہیں۔ اس کے بعد ان میں آپس میں ربط بڑھتا ہے، پھر انہیں ایک ہی جغرافیائی ماحول میں مل کر رہنا پڑتا ہے، تو اس دوران میں ان میں باہم ایک دوسرے پر غالب آنے، ایک دوسرے کو متاثر کرنے یا اس سے اثر پذیر ہونے یا ایک دوسرے کو اپنے اندر ضم کرنے کی جو مسلسل کشمکش ہوتی رہتی ہے، اس کا مطالعہ تاریخ کا ایک بڑا اہم اور دلچسپ باب ہے۔ جناب بی اے ڈار ریڈر اسلامک انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک کلچر لاہور نے زیر نظر ۷۱ صفحے کے انگریزی کتابچے میں اس کشمکش پر مختصر تبصرہ کیا ہے، جو آٹھویں صدی سے لے کر سترہویں صدی عیسوی تک برصغیر ہند و پاک میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے مذہبی افکار میں ہوتی رہی۔ ڈار صاحب کا یہ تبصرہ بڑا پر از معلومات اور فکر انگیز ہے، کیا ہی اچھا ہو، اگر اس کا اردو ترجمہ بھی ہو جائے۔

۷۱۱ء میں محمد بن قاسم نے سندھ فتح کیا۔ ۱۰۰۱ء میں محمود غزنوی کے حملے شروع ہوئے جن کے نتیجے میں لاہور غزنوی سلطنت کا مستقل مرکز بن گیا۔ مصنف کے نزدیک اس تین سو سال کے عرصے کی اس فکری ارتقا کے اعتبار سے زیادہ اہمیت نہیں، دونوں مذاہب اور دونوں تہذیبوں میں اصل کشمکش محمود غزنوی کے بعد شروع ہوتی ہے بقول مولانا سندھی کے اس دور میں جب مسلمان ہندوستان کی طرف بڑھے ہیں، تو ان کے دانش ور طبقے بغداد

بخارا اور وسط ایشیا کے دوسرے تہذیبی مراکز میں ہندوستان کے علوم و فنون اور ہندوستانی دانش سے ایک حد تک واقف ہو چکے تھے۔ چنانچہ جب ان کا اور ہندو دانش وروں کا فکری و تہذیبی سطح پر باہم مقابلہ ہوتا تھا تو وہ ان علوم و فنون میں بھی جو ہندوؤں کے خاص تھے، ہندو دانش وروں سے پیچھے نہ رہتے تھے۔ یہاں ذکر مسلمان دانش وروں کا ہے، ان کے فوجی طبقوں کا نہیں، جو زیادہ تر ترک تھے۔ اور کچھ ہی عرصہ پہلے ان ترکوں کی سفاکی سے خود بغداد کے عباسی خلفاء پر جو گزر چکی تھی، اس سے تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔

تاتاریوں کے ہاتھوں بغداد اور بغداد کے ساتھ پورے وسط ایشیا کے علمی و تہذیبی مرکزوں کی جس طرح مکمل تباہی ہوئی، اس کی وجہ سے دنیائے اسلام کے علم و دانش کے وہ سرچشمے جن کی سوتیں محمود غزنوی کے بعد ہندوستان پہنچنی شروع ہوئی تھیں، تقریباً خشک ہو گئے۔ اور اس طرح اسلامی ہند اپنے ہاں بغداد قاہرہ اور قرطبہ کو وجود میں نہ لا سکا۔ ورنہ اس کا قوی امکان تھا کہ جس طرح عباسی دور میں ایرانی اور دوسری غیر عرب قوموں کے دانشوروں نے اسلام اور اسلامی تہذیب کو اپنا کر ان کے علمی و تہذیبی خزانوں کو مالا مال کیا تھا، ہندوستان میں بھی یہی کچھ ہوتا۔ لیکن بدقسمتی سے ہوا اس کے برعکس۔ اسلام اور ہندو مذہب کے باہمی ردِّ عمل کے نتیجے میں ہندوؤں کے ہاں احیاء پرست اور تجدید خواہ فکری مذہبی تحریکوں نے جنم لیا، جو شروع میں اگرچہ مصالحت و مفاہمت کار جحان رکھتی تھیں، لیکن بعد میں وہ سیاسی سطح پر آکر اسلام و مسلمان دشمن ہو گئیں۔ ڈار صاحب نے اس کتابچہ میں ان تحریکوں پر کافی بحث کی ہے۔

اسلامی ہند کی تاریخ میں شروع ہی سے دو مستقل مکاتب فکر رہے ہیں۔ جن میں باہم کبھی کم اور کبھی زیادہ برابر کشمکش رہی۔ ایک تو اہل فقہ کا مکتب فکر تھا، اور دوسرا اہل تصوف کا۔ اول الذکر بالعموم ان فقہ حنفی کی روایات کے حامل تھے۔ جو بغداد سے منتقل ہونے کے بعد ترکستان کی غلو و شدت پسند فضا میں بڑی بے لوچ اور سخت ہو گئی تھیں۔ اور دوسرا مکتب فکر کم و بیش ان روایات پر عامل تھا، جن کی نشو و نما بغداد اور بغداد سے متاثر آزاد فکری و تہذیبی مرکزوں میں ہوئی تھی۔ چنانچہ اس مکتب کا عقیدہ وحدت الوجود جسے ہر جگہ ڈار صاحب نے Pantheism لکھا ہے جو صحیح نہیں، ابن عربی، ابن فارض، رومی وغیرہ سے مستفاد تھا، اور یہ اس فکری عالمگیریت اور وسعت مشربی کا نتیجہ تھا جس کا مخل مسلمانوں کے قدیم تہذیبی مرکزوں میں اگا تھا۔

بے شک مصنف نے اسلام اور ہندو مذہب کے باہمی عمل و ردِّ عمل کا اجمالی خاکہ بڑی خوبی سے